محمد مظہر الدین صدیقی

قوانینِ تاریخ اور عقیدۂ توحید

قرآن نے بت پرستی اور مشرکانہ رسوم کو اقوام کے زوال و ہلاکت کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ جن قوموں پر عذاب نازل ہوا، ان میں پہلے نبی بھیجے گئے جنھوں نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی، اور اللہ تعالیٰ کے قانونِ حیات اور قانونِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی۔ لیکن کفار و مشرکین نے ان نبیوں کا مذاق اڑایا، انکی تکذیب اور خلاف ورزی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور اپنی بت پرستی پر بدستور قائم رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر وہ زوال و انحطاط میں مبتلا ہو کر تاریخ کے اسٹیج پر سے غائب ہو گئیں بظاہر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شرک و بت پرستی کا قومی انحطاط و زوال سے اور عقیدۂ توحید کا جسمِ قومی کی صحت مندی اور اجتماعی ترقی سے کیا تعلق ہے، لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے، تو ان کا باہمی تعلق صاف واضح ہو جائیگا۔ شرک و بت پرستی انسان کے اس توہم پرستانہ اعتقاد کا نتیجہ ہے، کہ انسانی زندگی کی فلاح و سعادت کا کوئی ضابطہ و قانون نہیں ہے۔ جس طرح چاہو زندگی بسر کرو، قومی طاقت اور اجتماعی شیرازہ بندی میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ کیونکہ کائنات اور انسان کی فطرت اجتماعی کسی قانون کی پابندی کا تقاضہ نہیں کرتی جس کی خلاف ورزی ہلاکت و تباہی پیدا کرے۔ جن قوموں کا عقیدہ یہ ہو، اُن میں قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف باقی نہیں رہتا اور وہ اس یقین سے تہی دامن ہو جاتی ہیں کہ تاریخ انسانی بدکرداریوں کو معاف نہیں کرتی، بلکہ ان کا شدید ترین انتقام لیتی ہے، ایسی قومیں صرف باطل تصورات سے ڈرتی ہیں، اور غلط سہاروں پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ کہیں کسی ایسی چیز کو قومی زندگی کے لئے خیر و سعادت کا موجب سمجھ لیتی ہیں جس کا اجتماعی فلاح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کہیں ایسی باتوں سے ڈرنے لگتی ہیں جن کے کرنے نہ کرنے سے کوئی برا نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ بعض اشیاء مقامات یا مواقع کو منحوس اور بعض کو مبارک تصور کر لیا جاتا ہے۔ بعض مظاہرِ فطرت کو مفید اور بعض کو نقصان رساں قرار دیدیا جاتا ہے۔ اس طرح جن باتوں سے واقعی ڈرنا چاہئے ان سے مشرک قومیں نہیں ڈرتیں۔ بلکہ بیکار اندیشوں بے جا خوف و ہراس میں مبتلا ہو کر اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں ایسے اعمال اور ایسی کوششوں میں ضائع کر دیتی ہیں۔ جن سے قوم یا سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جو چیزیں واقعۃً قومی زندگی کو نقصان پہنچاتی ہیں مثلاً عیش پسندانہ عادات، لذت اور دولت کی غیر معمولی ہوس اور تعمیری کاموں سے عدم دلچسپی ان سے کوئی فرد خوف نہیں کھاتا۔ اسی طرح تاریخ میں مکافاتِ عمل جزا و سزا اور عذاب و ثواب کا جو غیر محسوس سلسلہ جاری ہے اس کا شعور بھی مضمحل ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ بے اصل باتوں سے خوف کھانا اور اتفاقی حوادث و مظاہر کو اپنی اُلفتوں اور وابستگیوں کا مرکز بنا لینا ایسی اقوام کی ایک مشترک خصوصیت ہوتی ہے، یہ تمام خرابیاں دراصل اس غلط عقیدے سے پیدا ہوتی ہیں کہ انسان کی فطرتِ اجتماعی کسی مستقل قانونِ حیات کی مقتضی نہیں جس سے مطابقت پیدا کرنا اجتماعی فلاح و اصلاح کے لئے ضروری ہو اور تاریخ کے واقعات کسی عمومی قانون یا مشیت کے تحت وجود میں نہیں آتے بلکہ ہر واقعہ کی ایک جداگانہ علت ہوتی ہے اور ہر حادثہ کے پس پشت ایک مستقل مشیت کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح

شرک و بت پرستی کے باعث قومیں تاریخ اور مشیت الٰہی کے عمومی قانون کا تصور کھو بیٹھتی ہیں۔ صرف ظاہری عبادات خارجی مراسم اور چند مخصوص قومی شعائر کی پابندی کو بقائے حیات کا وسیلہ سمجھ لیتی ہیں اور زندگی میں جو چیز واقعی کلیدی اور بنیادی حقیقت رکھتی ہے یعنی اچھے اعمال و اخلاق، سیرت کی مضبوطی اور اصول و قوانین کی پابندی ان کی طرف سے ایک عام غفلت برتی جانے لگتی ہے جس کا نتیجہ زوال و ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

عقیدۂ توحید کا انسان کی حیاتِ قومی اور ہیئتِ اجتماعی سے جو گہرا تعلق ہے اُسے واضح کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف آر ایچ ٹاونر (R. H. TOWNER) اپنی کتاب (PHILOSOPHY OF CIVILIZATION) میں لکھتا ہے:

> "غیر مرئی اور غیر محسوس حقائق کی پرستش کا انسان کے ارتقائے عقلی سے بڑا گہرا رشتہ ہے غیب پر ایمان لانا اور ان دیکھی چیزوں پر یقین رکھنا، انسان کی روحانی ترقی کا ایک حقیقی پیمانہ ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقلی حیثیت سے وہی قومیں ترقی پذیر ہیں جنھوں نے اپنی روحانی قوت کے ذریعہ غیر مرئی حقائق کا ادراک کیا۔
>
> چنانچہ تاریخ سے حسب ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں":-

بنی اسرائیل: ایک ان دیکھے خدا کا یقین بنی اسرائیل کا وہ نمایاں وصف تھا، جو انھیں اپنی ہمسایہ اور ہمعصر قوموں سے ممتاز کرتا تھا۔ بنی اسرائیل کی روحانیت اور مادی ترقی میں عروج و زوال اسی نسبت سے ہوا، جس نسبت سے انھوں نے ان دیکھے خدا پر اعتقاد پیدا کیا، یا اس اعتقاد سے دستبرداری اختیار کی۔ جن لوگوں نے سنہرے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تھی حضرت موسیٰؑ نے انھیں بنی اسرائیل میں سے خارج قرار دے کر قتل کروا دیا۔ اسی واقعہ کے بعد سے بنی اسرائیل کی حیاتِ قومی میں مادی ترقی اور نشوونما کے آثار نظر آنے لگے، ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، یوشعؑ، صموئیل، دانیال غرضکہ بنی اسرائیل کے تمام عقلا اور دانشور وہی لوگ تھے، جن کا اعتقاد ان دیکھے خدا پر بہت پختہ تھا، عام لوگوں کی عقلی پسماندگی نے انھیں کئی مرتبہ شرک و بت پرستی میں مبتلا کیا حضرت سلیمانؑ کی پرشکوہ حکومت کے بعد بنی اسرائیل شہوت پرستی، انسانی قربانیوں اور محسوس و مشہود دیوتاؤں کی پرستش میں گرفتار ہو گئے۔ ان کے پیغمبروں نے شخصی حیثیت سے ان دیکھے خدا کا دامن نہیں چھوڑا۔ لیکن بنی اسرائیل کے عام افراد بت پرست ہی رہے۔

یونان: یونانی عقل جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی گئی اسی قدر وہ محسوس اور مادی اشیاء کے بجائے مجرد تصورات و حقائق (ABSTRACTIONS) کی پرستش کرنے لگی۔ فیثا غورس نے حیات کے بنیادی قانون کا نظریہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ قانون حسیات اور جذبات کی رسائی سے ماوراء ہے۔ اس کا وجود غیر مرئی اور صرف انہیں افراد کے لئے قابلِ فہم ہے جو مجرد تصورات قائم کر سکیں، سقراط ہمیشہ تجریدی تصورات (ABSTRACT CONCEPTIONS) کی تلاش کرتا اور ذہنی تجریدات کی اہمیت پر زور دیتا رہا۔ لیکن غیر مرئی اشیاء پر یونانی ذہن کو جو قدرت حاصل تھی اس کا سب سے بڑا ثبوت خود یونانی زبان ہے، جو تجریدی حقائق کے اظہار کے لئے دوسری تمام زبانوں سے زیادہ موزوں ہے۔

روم: بنی اسرائیل کی مانند روما کے باشندوں کو بھی یہ تعلیم دی گئی تھی کہ وہ تصاویر یا بتوں کی پرستش نہ کریں۔ پلوٹارک نے اپنی مشہور

کتاب سوانح (TARCH'S LIVES) میں لکھا ہے کہ نوما نے رُومیوں کو تاکید کی تھی کہ وہ خدا کی ہستی کو جانوروں یا انسانوں کی شکل نہ دیں۔ رومی تاریخ کے ابتدائی ایک سو ستتر سال تک کسی تصویر یا مجسمہ کا وجود رومیوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔ اِن کے مندر بتوں اور مجسموں سے پاک تھے اور ان کا عام اعتقاد یہ تھا کہ خدا کی ہستی کو محسوس اور مرئی صورت دینا اس کے تقدس پر دھبہ لگانے کے مترادف ہے۔ ماسن (MOMMSON) کی تاریخ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے، وہ کہتا ہے کہ رومیوں کے ابتدائی طریق پرستش میں خدا کی تصویر یا اس کی کسی محسوس اور مرئی شکل کا وجود نہ تھا۔ اسی طرح رُومی عبادت کے اغراض کے لئے کوئی علیحدہ مندر یا عبادتگاہ نہیں بناتے تھے، بعض لاطینی قبائل نے دیوتاؤں کے جو بت تراشے تھے، وہ غالباً یونانیوں کی تقلید تھی، اور بعض مقامات پر ان کے چھوٹے چھوٹے مندر بھی تھے لیکن اس قسم کی تصویر آرائی اور بت سازی کو نوما کے قوانین کی خلاف ورزی خیال کیا جاتا تھا۔ اور اس کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا۔ کہ یہ ایک بدعت ہے۔ جو غیر قوموں سے مستعار لی گئی ہے۔ خود رومی مذہب نے خدا کی کوئی مرئی اور محسوس شکل نہیں قائم کی تھی۔

عیسائی: قدیم ترین عیسائی نسلی اور قومی حیثیت سے یہودی اور حضرت موسیٰؑ کے قانون کے پیرو تھے۔ جس نے تصویر سازی اور مجسمہ تراشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے کبھی کسی مادی یا محسوس شکل کی پرستش نہیں کی اپنی پوری زندگی میں مجرّد (ABSTRACT) حقائق پیش کرتے رہے۔ تصاویر اور مجسموں کے احترام کا چرچا عیسائیوں میں چوتھی صدی کے بعد رائج ہوا، اس صدی کے ختم پر عیسائیوں کی انحطاط پذیر قوم کے لئے ایک غیر مرئی خدا کی پرستش دشوار ہو گئی اور انھیں عبادت کے اغراض کیلئے مادی اور محسوس اشیاء کی حاجت ہوئی۔ چنانچہ ولیوں مقبروں اور تبرکات کا غیر معمولی احترام اسی زمانہ کی پیداوار تھا۔ لیکن عیسائیوں کے بت پرستانہ میلانات انہی علاقوں میں زیادہ نمایاں تھے، جو رُومی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گئے تھے۔ وحشی جرمن[1] اقوام جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کیا۔ بالطبع بت پرستانہ میلانات سے نفریں تھیں۔ اسی طرح مشرق و مغرب کے دُور دراز صوبے، جہاں رُومی تہذیب کی روشنی بہت کم پھیلی تھی، بت پرستی اور مشرکانہ رسوم سے نسبتاً پاک تھے۔

مُسلمان: مُسلمانوں اور عیسائیوں میں بارہ سو سال تک جو کشمکش جاری رہی، اس کی تاریخ بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ بت پرستی اور مشرکانہ رسوم قوموں کو فوجی شکست اور اجتماعی انتشار کی طرف لے جاتی ہیں۔ اِسلامی تاریخ کی پہلی صدی میں اُنھیں ہر مقام پر عیسائیوں کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی، کیونکہ اس زمانہ کے عیسائی شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے، اور اس کے بالمقابل مُسلمان خالص توحید کے علمبردار تھے جو ابتدائے شرک کی تمام آمیزشوں سے پاک تھی جب مسلمانوں اور عیسائیوں میں بت پرستی اور شرک کا زور قریب قریب برابر ہو گیا تو مسلمانوں کی فتوحات کا زور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلمان اور زیادہ مائل بہ شرک ہوتے گئے۔ دُوسری طرف عیسائیوں نے رفتہ رفتہ بت پرستانہ اور مشرکانہ رسوم سے توبہ کر لی، اُس وقت سے عیسائی مُسلمانوں پر غالب آنے لگے۔ فلسطین کی ارضِ مقدس جس طرح یکے بعد دیگرے

---

[1] بعد میں یہی جرمن اقوام رومی عیسائیوں کی حاکم بن گئیں اور ان کے مُلک میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئیں، کیونکہ رومی عیسائیوں کے برعکس جو حضرت عیسیٰؑ کی خالص توحید کو چھوڑ کر شرک و بُت پرستی میں مبتلا تھے۔ جرمن فاتحین تصاویر کی پرستش نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اُن کے اندر اولیا اور بزرگوں کی کرامات اور تبرکات کے متعلق کوئی خاص عقیدہ پایا جاتا تھا۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان منتقل ہوتی رہی وہ بالکل اسی ریاضیاتی قانون (MATHEMATICAL LAW) کے مطابق تھی۔"

آگے چل کر یہی مصنف اس امر کی عقلی توجیہہ بھی پیش کرتا ہے، کہ شرک و بت پرستی سے قومیں کیوں زوال و بربادی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ اور توحید خالص ان کے اندر کیوں ترقی پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"تجریدی تصورات کی پرستش انسانی ذہن کو آزاد کر دیتی ہے۔ جن قوموں کو عبادت کیلئے کسی مرئی اور محسوس شکل کا توسط نہیں ملتا، وہ مجبوراً اپنے معبود کا کوئی خیالی تصور پیدا کرتے ہیں خدا کی ذات و صفات کے بارے میں انھیں جو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس سے انھیں اپنے معبود کا تصور آراستہ کرنے میں مدد ملتی ہے لیکن چونکہ یہ صفات عقلی ہوتی ہیں اور کسی محسوس و مجسم صورت میں ان کے سامنے نہیں آتیں اس لئے ہر فرد اور ہر نسل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے معبود کا تصور خود قائم کرے، کیونکہ کوئی بنا بنایا مکمل اور محسوس و مشہود معبود اس کے پیش نظر نہیں ہوتا ہے۔ اس تصور کو قائم کرنے اور اس کے خدوخال معین کرنے میں ہر فرد اور ہر نسل کو دماغی کاوش کرنی پڑتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی عقل ترقی پذیر رہتی ہے۔ توحید کے پرستاروں کی ہر نسل کا معبود اپنی پیشرو نسل کے معبود سے جدا ہوتا ہے۔ اس طرح عقلی آزادی برقرار رہتی ہے۔ اور انسانی ذہن پابہ زنجیر نہیں ہونے پاتا، جب کبھی عقل و تفکر کا طوفان امنڈتا ہے تو وہ پہلے کے تعمیر کردہ بند کو توڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ بت پرستی اس ارتقائے فکر کا راستہ ہر طرف سے روک دیتی ہے۔ ایک بت جسے دائمی تقدس حاصل ہو گیا ہو، جس کی پرستش زمانہ دراز سے معین و مقرر ہو۔ اور جسے از روئے قانون مستند تصور کر لیا گیا ہو، وہ ہر نئی نسل کو ذہنی حیثیت سے ایک خاص سطح پر روک رکھتا ہے۔ اور کسی فرد یا نسل کے لئے یہ غیر ممکن ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی روایات اور پرستش کے معینہ طریقوں سے ہٹ کر کوئی نئی راہ اختیار کرے، صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن اصنام پرست اقوام کے بت بلا ترمیم و تبدیلی اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔ وہ اختلاف و تنوع جو ایک غیر مرئی خدا کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ بت پرستوں اور مشرکوں کی سوسائٹی میں ناممکن ہے ہر نسل کو یہ سکھانے کے بجائے کہ تم اپنے معبود کا تصور خود آراستہ کرو، اسے صرف یہ اجازت ہوتی ہے، کہ وہ اپنی آنکھیں استعمال کر کے اپنے معبود کو اس کے تخت پر بیٹھا ہوا دیکھ لے جہاں وہ صدیوں سے مسند نشیں ہے۔"

اس توسیہہ و تشریح میں ہم اپنی طرف سے اتنا اضافہ کریں گے کہ خدا پرستی اور توحید اسی صورت میں قومی اور اجتماعی زندگی کیلئے مفید و سود مند ہو سکتی ہے۔ جب اس کے ساتھ مشیت الٰہی کے قانون کا بھی کوئی تصور موجود ہو، جو قومیں صرف خدا کے وجود کو تسلیم کر لیتی ہیں، خواہ وہ خدا مرئی ہو یا غیر مرئی، محسوس شکل میں پیش نظر ہو، یا غیر محسوس شکل میں، لیکن خدا کے تصور سے اس کی مشیت کے عمومی قانون کا جو تصور مستنبط ہوتا ہے اسے تسلیم نہیں کرتیں، انکی خدا پرستی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسی قوموں کا خدا بھی ایک بت بن کر رہ جاتا اگرچہ یہ بت خیالی اور تصوری ہوتا ہے اور اس کی کوئی ظاہری تصویر نہیں بنائی جاتی، ایسی قوموں میں تقویٰ کی صفت نہیں پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ تقویٰ دراصل قانون مکافات عمل کا خوف ہے، پھر اگر یہ تصور ہی نہ موجود ہو، کہ خدا کا کوئی مستقل قانون حیات یا اس کی کوئی عمومی مشیت بھی ہے جس کے ساتھ مطابقت کرنا قومی اور اجتماعی زندگی کی فلاح کے لئے ضروری ہے۔ تو خدا کا وجود ایک شخصی اور انفرادی وجود بن جاتا ہے اور اس کی محبت بھی ایک معین اور مشخص ہستی کی محبت ہو جاتی ہے نہ کہ اس قانون زندگی، اس تصور حیات اور طرز فکر کی محبت

جو خدا کی عمومی مشیت سے وجود میں آتا ہے۔ پھر چونکہ قانونِ مکافاتِ عمل پر جو جو مشیت الٰہی کے عمومی قانون کی ایک فرع ہے، لوگوں کو اعتقاد نہیں رہتا، اس لئے نہ وہ نیکی کے خوشگوار نتائج کی توقع سے پُرامید ہو سکتے ہیں اور نہ بدی اور بدکرداری کے نتائج سے خوف کھا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا پر ایمان لانا اس کے قانون جزا و سزا پر ایمان لانا ہے۔ اگر جزا و سزا کے قانون کا اعتقاد نہ ہو تو خدا کو ماننا نہ ماننا یکساں ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس جزا و سزا کا تعلق صرف عالم آخرت سے نہیں۔ بلکہ اسی دنیا میں اعمال کی جزا و سزا انسان کو انفرادی اور قومی حیثیت سے ملتی رہتی ہے۔ اس لئے جو قومیں جزا و سزا اور عذاب و ثواب کو صرف آخرت سے متعلق سمجھتی ہیں وہ رہبانیت میں مبتلا ہو کر عذاب الٰہی کی مستحق بن جاتی ہیں، خدا کا قانونِ جزا و سزا تاریخ کے ہر دور میں اپنے نتائج ظاہر کرتا ہے۔ جو قومیں دنیوی حیثیت سے ترقی کرتی ہیں وہ بھی اسی قانون کے مطابق آگے بڑھتی ہیں، جو قومیں جہالت، افلاس اور غلامی میں مبتلا ہو کر ذلت و پستی کے قعر میں گرتی ہیں۔ ان پر بھی یہ دُنیوی عذاب اسی قانون کے مطابق نازل ہوتا ہے، لہٰذا خدا کا تصور دراصل ایک عمومی اور کلی قانون کا تصور ہے۔ جس کے مطابق اجتماعی فلاح و ترقی اور اجتماعی زوال و شکست کے تاریخی مظاہر رونما ہوتے ہیں۔ اگر انسان کا ذہن اس کلی اور عمومی قانون کے تصور سے خالی ہو، تو اس کی خدا پرستی بھی بت پرستی ہے۔

اسلام کا نظریۂ تاریخ

مصنفہ مظہر الدین صدیقی ایم۔اے:۔ اس کتاب میں یہ بحث کی گئی ہے۔ کہ قرآن نے اقوامِ عالم کے عروج و زوال اور تعمیر و تخریب کے کیا اصول بیان کئے ہیں۔ نیز مشیتِ الٰہی کے صحیح مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ تاریخی انقلابات اور قوموں کے عروج و زوال میں مشیتِ الٰہی کا انداز کار کیا ہے؟ اور اگر خدا کی مشیت کے بھی کچھ قوانین اور اصول ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تاریخ میں یہ اصول و قوانین کس طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ مصنف نے قرآن پر ہر حیثیت سے نظر ڈال کر اس کا ایک تاریخی نظریہ مرتب کیا ہے۔ اور بتایا ہے، کہ اس نظریہ کی رُو سے نہ صرف قدیم اقوام کی ترقیوں اور تباہیوں کی توجیہ کی جا سکتی ہے بلکہ مسلمانوں کے زوال و ادبار کے اسباب بھی اس نظریہ سے خود بخود مستنبط ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یورپ اور امریکہ کی تاریخ اور ان اقوام کے عروج و زوال پر بھی قرآن حکیم کے نظریہ سے کافی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مصنف نے قدیم و جدید یورپ اور امریکہ کی تاریخ سے جستہ جستہ واقعات پیش کئے ہیں جن سے قرآنی نظریہ تاریخ کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ ۲ کلب روڈ۔ لاہور